ناصر کاظمی

جدید شعرامیں ناصر کاظمی ایک مقام رکھتے ہیں۔ان کی پیدائش انبالہ میں ۸/دسمبر ۱۹۲۵ کو ہوئی۔انکے والد محمد سلطان کاظمی رائل انڈین آرمی میں صوبہ دار میجر تھے۔ناصر کاظمی کی ابتدائی تعلیم نیشنل ہائی اسکول پشاور میں ہوئی۔ڈی بی مڈل اسکول ڈکشائی میں بھی تعلیم حاصل کی۔مسلم ہائی اسکول انبالہ، اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بھی وابستگی رہی۔

والد کے پیشہ ورانہ تبادلوں کی وجہ سے ان کا بچپن کئی شہروں میں گزرا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میٹرک مسلم ہائی اسکول انبالہ سے کیا تو آگے کی تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور آ گئے ۔ جہاں وہ ایک ہوسٹل میں رہتے تھے۔ان کے استادِ خاص رفیق خاور ان سے ملنے کے لیے اقبال ہاسٹل میں جاتے اور ان کے کمرے میں شعر و شاعری پر بات کرتے تھے۔تاہم اس کے باوجود بھی ناصر بی اے سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے اور یہ سلسلہ یہیں رک گیا۔ناصر کاظمی ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا تھا۔

ناصر نے ایک رسالہ "اوراقِ نو" کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۵۲ء میں رسالہ "ہمایوں" کی بھی ادارت سنبھالی۔لیکن ۱۹۵۷ میں ہمایوں کے بند ہونے کے بعد ناصر کاظمی محکمہ اصلاحات دیہات سے منسلک ہو گئے۔اس کے بعد وہ زندگی کے باقی دنوں میں ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔

ان کے شعری مجموعے 'برگِ نے'، دیوان اور پہلی بارش ان کی شہرت کی دلیل ہیں یہ مجموعے غزلوں کے ہیں جب کہ "نشاطِ خواب" کے نام سے نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔سُر کی چھایہ ان کا منظوم ڈراما ہے۔ برگِ نے ان کا پہلا مجموعہ کلام تھا جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ناظر نے چند شاعروں کے انتخابات بھی شائع کئے۔ان میں انتخاب میر، انتخاب نظیر، انتخاب ولی اور انتخاب انشا شامل ہیں۔ان کی ڈائری ۱۹۹۵ میں شائع ہوئی۔ناصر کاظمی کا انتقال ۲/مارچ ۱۹۷۲ کو ہوا۔

عشق اور محبت کے تعلق سے مختلف کیفیات کا بیان ناصر کاظمی کی غزل کی امتیازی خصوصیت ہے۔ناصر کاظمی کا عشق ارضی اور مادی ہے۔ وہ عشق کو آفاقی یا سماوی نہیں بناتے۔ناصر کاظمی کی غزل میں عشقیہ جذبات کا اظہار جس سادگی اور سچائی کے ساتھ ہوا ہے وہ ناصر کاظمی کی بہت بڑی طاقت ہے۔محبت اور عشق کی مختلف کیفیات کے بیان میں ناصر کاظمی کی سرشاری اور دیوانگی کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''ناصر کاظمی کا کٹر سے کٹر ترقی پسند دوست بھی ان کے کلام میں ''روح عصر'' تلاش نہیں کر سکتا۔اجتماعی سماجی زندگی کے خفیف ترین پرتو کو ڈھونڈنے کے لئے ''برگ نے'' اور ''دیوان'' (اور بعد کی غزلوں) کو بڑے غور و تفحص سے پڑھنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ شیش محل یا منار آج والی محفوظ شاعری بھی نہیں ہے۔بس یہ ہے کہ ناصر کاظمی نے اپنے عشق اور عشق کی لائی ہوئی درد کی دولت کے علاوہ ہر چیز پر آنکھ بند کر لی تھی۔وہ فراق اور فیض وغیرہ سے بہت مختلف آدمی ہیں۔اس کی دلیل ان کا عشقیہ رویہ ہے جو زمانے کے اور غموں کو خاطر میں نہیں لاتا۔نکتہ یہ ہے کہ عشقیہ شاعری ہونے کے باوجود ان کی شاعری متروک Archaic نہیں ہے کیوں کہ انہوں نے طرح طرح سے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ صرف اپنی طرف سے بول رہے ہیں۔''[۱]

اس اقتباس سے نہ صرف ناصر کاظمی کی شاعری کی انفرادیت سامنے آتی ہے بلکہ نئی غزل کی تعبیر و تشکیل میں ناصر کاظمی کے تاریخی رول کا بھی پتہ چلتا ہے۔سوال یہ ہے کہ غزل کی ایمائیت اور اس کا داخلی لہجہ پہلے بھی موجود تھا۔عشق کی کیفیات اور انہیں مقصد حیات کی شکل میں پیش

کرنے کی مثالیں بھی موجود تھیں۔ فاروقی صاحب جب یہ لکھتے ہیں کہ ناصر کاظمی نے عشق اور عشق کی لائی ہوئی درد کی دولت کے علاوہ ہر چیز سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ فیض و فراق سے مختلف آدمی تھے تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ناصر کاظمی نے اجتماعیت اور عوامیت کے چکر میں پڑ کر اپنی غزل کو عصری، سیاسی و سماجی حسیت کی حامل بنانے کی ایسی کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ جیسا ان کے بعض معاصر اور پیش رو شعرا نے کیا تھا۔ انہوں نے رومانیت کی چادر میں منھ لپیٹ کر انقلاب اور بغاوت کے نعرے نہیں بلند کئے۔

ناصر کاظمی کے نزدیک روح عصر کا مطلب انقلابی اور باغیانہ انداز فکر کی شاعری نہیں تھی۔ فاروقی صاحب ناصر کاظمی کی شاعری میں اجتماعی اور سماجی زندگی کا عکس ڈھونڈنے کیلئے غور تفحص کی شرط ان کے قارئین پر عاید کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ناصر کی عصری اور سماجی حسیت ان کی منزلوں میں تیرتی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ ناصر کاظمی کی غزل اپنے عہد کی سماجی و سیاسی صورت حال سے علاقہ نہیں رکھتی۔ فاروقی صاحب جب ناصر کاظمی کو فراق اور فیض سے مختلف آدمی کہتے ہیں تو اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ ناصر کا عشقیہ رویہ زمانے کے غموں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دیکھا جائے تو ناصر کا یہ عشقیہ رویہ ایک ترقی پسند رویہ بھی کہا جائیگا لیکن ناصر کاظمی نے اگر اپنے عشق کی دنیا میں مست ہو کر زندگی کے دوسرے حقائق سے آنکھیں بند کر لی ہیں تو اس سے ناصر کاظمی کی انفرادیت قائم نہیں ہوتی۔ یہ تو کوئی معمولی شاعر بھی کر سکتا ہے۔ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ عشق کے معاملات اواس کی مختلف کیفیات کو ناصر نے کس طرح محسوس کیا ہے اور اس کے اظہار میں کن شعری وسیلوں سے کام لیا ہے۔ ناصر کاظمی کو تخلیقی عمل کی ان پیچیدگیوں کا بھی پورا احساس تھا جس میں لفظ کی معنویت وہی نہیں ہوتی جو لغت میں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

ہجوم نشۂ فکر سخن میں
بدل جاتے ہیں لفظوں کے معانی

ہجوم نشۂ فکر سخن ناصر کاظمی کی اس چھوٹی سی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ان کی دیکھی سمجھی اور محسوس کی ہوئی ہے۔ محبت اور عشق کی کہانیاں اردو غزل میں جس جس طرح سے بیان کی گئی ہیں ان کی روشنی میں کسی شاعر کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ صرف فلاں شاعر کا حصہ ہے بہت مشکل کام ہے۔ لیکن یہ مشکل اس وقت آسان ہو جاتی ہے جب ہم ناصر کاظمی کی غزل کا بغور مطالعہ کر کے کسی خیال کسی احساس سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور ناصر کاظمی کی آواز دور سے پہچان لیتے ہیں۔ ان کی ایک عشقیہ غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

آرائش خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو
یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
ٹوٹے کبھی تو خواب شب و روز کا طلسم
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو
یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنج بے خمار کی اب انتہا بھی ہو
دیوانگی شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

مندرجہ بالا اشعار پر غور کریں تو ایک بات واضح ہے کہ شاعر یک رنگی و یکسانیت کی فضا سے نکل کر نئے شے کی تمنا کرتا ہے۔ اس شعر میں

بات زیادہ وضاحت سے کہہ دی گئی ہے۔

یہ کیا کہ ایک طو سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

یہ محبت اور عشق کا بدلتا رویہ ہے جو ناصر کاظمی کے اس شعر میں موجود ہے۔ ناصر کاظمی کا پانچواں شعر غالب کے شعر کی یاد دلاتا ہے۔

بے درو دیوار سا اک گھر بنایا چاہئے
کوئی ہم سایہ نہ اور پاسباں کوئی نہ ہو

اس سے پتہ چلتا ہے کہ فکر و احساس کی دنیا کس قدر اپنے سائے پھیلاتی جاتی ہے اور اس دنیا میں بہت کچھ مشترک ہوتا ہے۔ ناصر کے عشقیہ اشعار دیکھئے جنہیں پڑھ کر صرف ناصر ہی کی یاد آتی ہے

گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دور نکل
یک سے ترا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانوں پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل

تو شریک سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی
آج کھلنے ہی کو تھا درد محبت کا بھرم
وہ تو کہئے کہ اچانک ہی تری یاد آئی
پھر کوئی دل کو دکھائے ناصر
کاش یہ گھر کسی عنوان چمکے
ترے آنے کا دھوکا سا رہا ہے
دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے
تو ہے یا ترا سایہ ہے
بھیس جدائی نے بدلا ہے
دروازے سر پھوڑ رہے ہیں
کون اس گھر کو چھوڑ گیا ہے
جدائیوں کے زخم درد زندگی نے بھر دیے
تجھے بھی نیند آ گئی مجھے بھی صبر آ گیا
میرے دل سے نہ جا خدا کے لئے
ایسی بستی نہ پھر بسے گی کبھی

ان شعروں میں نہ تو زبان کی سطح پر کوئی مشکل پسندی ہے اور نہ فکر و خیال میں کسی قسم کی پیچیدگی۔ بہت سادگی اور سچائی کے ساتھ ناصر کاظمی

نے اپنے عشقیہ جذبات کا اظہار کر دیا ہے۔آخر ان اشعار میں ایسی کون سی خوبی ہے جو ناصر کاظمی سے مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے یہ اشعار ہمیں اچھے لگتے ہیں۔اس سوال کے جواب کے لئے شمس الرحمن فاروقی کے اسی اقتباس سے مدد لی جاسکتی ہے۔

''نکتہ یہ ہے کہ عشقیہ شاعری ہونے کے باوجود ان کی شاعری متروک نہیں ہے۔کیوں کہ انہوں نے طرح طرح سے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ صرف اپنی طرف سے بول رہے ہیں۔''

اس اقتباس سے یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ عشقیہ شاعری میں تکرار اور تقلید کی جتنی گنجائش ہے اتنے ہی خطرات بھی چھپے ہوئے ہیں لیکن ناصر کاظمی نے عشقیہ معاملات کے بیان میں اپنی ایک منفرد آواز پیدا کی ہے۔اگر یہ آواز ناصر سے مخصوص ہے جو یقینا ہے تو اس میں ناصر کے انداز گفتگو اور انداز فکر دونون کا حصہ ہے۔ناصر کے مندرجہ بالا اشعار پر اگر غور کریں تو بظاہر سادہ سے شعروں میں انہوں نے کوئی نہ کوئی پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ذرا اسی شعر پر غور کریں

گلی گلی تری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو مری حدوں سے دور نکل

ناصر نے اس شعر میں ایک خوبصورت تضاد پیدا کیا ہے۔لفظ ''پیارے'' بھی شعری خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔شعر کا لہجہ سمجھانے کے انداز کو ظاہر کرتا ہے۔جیسے کوئی شخص اپنی شوخی رفتار میں گم ہے اور اس کو یہ معلوم نہیں کہ وہ جس زمین پر چل رہا ہے وہ اس میں بہت کچھ اس کے عاشق کا پوشیدہ اور اگر بغور دیکھئے تو ایسا احساس اور شرمندگی ہوگی کہ وہ جس کی وجہ سے بھاگ رہا ہے وہ تو صرف اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔اور وہ خوش ہے کہ میں تو آزاد ہو کر نئی فضا میں آ گیا، پھر مصرع ثانی میں شاعر چیلنج کرتا ہے کہ مجھ سے اتنی وحشت ہے تو مری حدوں سے دور نکل۔اس میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ میری وحشت کا تقاضہ یہ ہے کہ تم مری حدوں سے باہر ہو جاؤ اور اس مصرعے میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تم میری حدوں سے دور نکل ہی نہیں سکتے۔اور تضاد کا پہلو اس طرح نکلتا ہے کہ پہلے مصرعے میں شاعر ایک طرف اسے ہدایت کرتا ہے کہ ہر طرف میری یاد بچھی ہے تو اپنے پاؤں سنبھال کر رکھو اور دوسری طرف وہ اسے ان حدود اور علاقوں سے نکلنے کے لئے بھی کہتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ جب وہ ان حدود سے نکلے گا تو لازماً اس کی یادیں اس کے پاؤں کے تلے آئیں گی۔میر کا شعر یاد آ جاتا ہے۔

بوئے آدم ہی ہے تمام زمیں
پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں

اس شعر کی آفاقیت کے آگے ناصر کاظمی کا شعر چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔آدم کا لفظ لا کر میر نے شعر کو پھیلا دیا ہے۔اور پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں کا مصرعہ بھی اتنا برجستہ اور مربوط ہے کہ وہ میر ہی کا حصہ ہے۔ناصر کاظمی کے شعر میں لفظ ''مری'' سے یوں تو شاعر کی ذات مراد ہے مگر یہ لفظ مری کو بڑے سیاق میں دیکھیں تو یہ شعر عشقیہ نہ ہو کر کسی قوم کے شاندار ماضی کا علامیہ بن جاتا ہے۔جیسا کہ کلیم عاجز کے اس شعر میں ہے؛

ہم نے کیا کیا نقش بنائیں شمعیں جلائیں ہیں کیا کیا
رستہ رستہ یاد کرے ہے محفل محفل جانے ہے

ناصر کے شعر میں کوئی شخص اس کے عشقیہ پہلو پر اصرار بھی کر سکتا ہے۔غزل کا شعر اپنی ایمائیت اشاریت اور لفظیات کی وجہ سے بیک وقت کئی مفاہیم کا حامل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر قاری غزل کے ایک شعر سے اپنے طور پر معنی نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے لیکن اس غزل کے دوسرے شعر سے کوئی اور معنی نہیں نکالے جاسکتے۔

ایک سمے ترا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانوں پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل

ناصر کاظمی کی شاعری میں عصری وسماجی حسیت بھی ان کے تخلیقی تجربے سے خالی نہیں۔ان کے یہاں سماجی وسیاسی پس منظر تخلیقی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ناصر کاظمی نے ملک کی آزادی کے نتیجے میں انسانی زندگی کی جو پامالی دیکھی تھی اس سے ان کی شخصیت نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اور یہ اثر ان کی مختلف غزلوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔تہذیبی زندگی کے ڈھانچے کا بکھر جانا ناصر کاظمی کا سب سے بڑا دکھ ہے۔اس تہذیب کا رشتہ مختلف قوموں اور ملتوں کے رسم ورواج سے ہے۔انہوں نے نہ صرف ہجرت کو قریب سے دیکھا بلکہ ایک مہاجر کی حیثیت سے اسے جھیلا بھی ہے۔ناصر کاظمی کے ان اشعار کو ان کے عہد کی سیاسی اور سماجی صورتحال سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا:

بدل سکو تو بدل دو یہ باغباں ورنہ
یہ باغ سائے کو سرو سمن کو ترسے گا
نہ سمجھو تم اسے شور بہاران
خزاں پتوں میں چھپ کر رورہی ہے
کیا سنیں شور بہاراں اب کے
ہم نے کچھ اور سنا ہے اب کے
پتیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں
قتل گل عام ہوا ہے اب کے
کیا تماشا ہے کہ بے ایام گل
ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہوگئے
یہاں تک آئے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے
رن پڑا ہے رن کہیں دوسرے کنارے پر
ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو سورج کرن کو ترسے گا

پہلے شعر میں چمن اور باغبان کو ناصر نے روایتی انداز میں استعمال کیا ہے۔باغباں حاکم و بادشاہ کا استعارہ ہے اور چمن کسی ملک کا ایک شاعر کی سب سے بڑی طاقت اس کی آواز ہے وہ نہ تو اس آواز کا سودا کرسکتا ہے اور نہ ہی وہ اس سے تائب ہوسکتا ہے ناصر کاظمی کے دوسرے شعر میں بات واضح انداز میں کہہ کر جابر وظالم بادشاہ کے خلاف اعلان جنگ ہے اور پھر وہ خبردار بھی کرتے ہیں:

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا ایک دن
زمین پانی کو سورج کرن کو ترسے گا

ناصر کاظمی کی غزل میں جو ایک کسک اور ٹیس ہے اس کا رشتہ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں انسانی زندگی کی پامالی سے ضرور قائم ہے ناصر کی شاعری چاہے جتنی ذاتی اور داخلی ہو اس کے رشتے اس عہد کی سیاسی سماجی صورت حال سے گہرے طور پر مربوط ہیں ناصر نے کہا تھا:

لفظوں میں بولتا ہے رگ عصر کا لہو
لکھتا ہے دست غیب کوئی اس کتاب میں

یہ دست غیب دراصل اس بات کا اشاریہ ہے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں اگر ہمارا ضمیر زندہ ہے تو ہماری آواز رگ عصر سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔دست غیب سے کی ترکیب سے ذہن شاعری کے الہامی تصور کی طرف جاتا ہے لیکن رگ عصر کا لہو کے فقرے سے شعر کے شعوری پہلو کی

طرف بھی ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ ناصر کی ایک غزل دیکھئے جو اس عہد کی زندگی کا ایک بھرپور منظر نامہ ہی:

کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در
یہ وہی دیار ہے دوستو جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر
میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یوں ہی شہر شہر نگر نگر
کہاں کھو گیا میرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر
جنہیں زندگی کا شعور تھا انہیں بے زری نے بجھا دیا
جو گراں تھے سینہ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر
مری بے کسی کا نہ غم کرو مگر اپنا فائدہ سوچ لو
تمہیں جس کی چھاؤں عزیز ہے میں اسی درخت کا ہوں ثمر
یہ بجا کے آج اندھیرا ہے ذرا رت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

اس غزل کو پڑھ کر اس شہر کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ جو وقت کے بے رحم ہاتھوں سے قتل و غارت گری کے نتیجے میں اپنی رونق کھو بیٹھے تھے غزل کا مطلع ناصر کاظمی نے جس ذہنی کیفیت میں کہا ہو گا اس کا اندازہ شعر کی قرأت کرتے وقت کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے شعر کا تعلق اس ہجرت سے ہے جو تقسیم کا عطیہ تھی۔ ناصر کاظمی جس قافلے سے بچھڑ جانے پر افسردہ ہیں اس میں نہ جانے کتنے بدنصیبوں کا دکھ درد شامل ہے۔ اس ہجرت نے جن احساسات کو جنم دیا ہے وہ گزشتہ پچاس سالہ ادب میں ایک اہم باب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری میں ماضی کی یاد اور کھوئے ہوؤں کی جستجو ایک اہم رجحان کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ رفتگاں کا سراغ لگانے کی فکر نے ناصر کاظمی کو جس مقام پر پہنچایا تھا اس کے نتیجے میں حال سے بیزاری و مایوسی غیر فطری نہیں تھی۔ ماضی کی بازیافت اس بات کی غماز ہے کہ شاعر حال سے غیر مطمئن ہے۔

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت
میں تو بیتے دنوں کی کھوج میں ہوں
تو کہاں تک چلے گا میرے ساتھ
نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی